جنگِ آزادی کی ایک دلیر مجاہدہ

جناب اختر راہی

حضرت محل

جہادِ حریت کی داستان

تاریخ کے صفحات ایسی ہستیوں کے کارناموں سے منور ہیں جنہوں نے انتہائی نامساعد حالات میں رہتے ہوئے ملک و قوم کی ایسی خدمت انجام دی کہ آنے والی نسلیں اُن کے کارناموں پر فخر کریں گی۔ مسلمانوں کی تاریخ میں بھی ایسی بیسیوں ہستیاں موجود ہیں جن کے ولولہ انگیز کارنامے آج بھی خون کی گردش تیز کر دیتے ہیں۔ اور جذبات میں ہلچل مچا دیتے ہیں۔ مسلمانوں کی تاریخ میں یہ مقام صرف مردوں نے ہی حاصل نہیں کیا بلکہ عورتیں بھی جان کی بازی لگا کر قوم کی حفاظت کرتی ہیں۔ انہی روشن صفات ہستیوں میں جنگِ آزادی کی مجاہدہ حضرت محل بھی شامل ہیں۔

انیسویں صدی کے نصف اوّل میں دربارِ لکھنو کا تصور کیجئے۔ ہر طرف عیش پرستی کا دور دورہ تھا۔ اکابرین تیغ و تفنگ کی بجائے مضراب و رباب سے دل بہلاتے تھے۔ رقص و سرود سے پیاس بجھاتے تھے۔ اور معاشرے کی رگ رگ میں آرام طلبی اور عیاشی کے جراثیم سرایت کر رہے تھے اور یہ تنزل واجد علی شاہ اختر کے دور میں آخری حدوں کو چھو رہا تھا۔ اِس کے برعکس ایسٹ انڈیا کمپنی ہوسِ ملک گیری میں انڈیا کے صوبوں کو یکے بعد دیگرے اپنی قلمرو میں شامل کرتی جا رہی تھی۔ لارڈ ولزلی کی سخت پالیسی کے مطابق دیسی ریاستوں کو کمپنی کے ماتحت کر دیا گیا۔ اس ضمن میں واجد علی شاہ اختر کو اسیر کر کے کلکتہ میں نظر بند کر دیا اور لکھنؤ میں ریذیڈنٹ بہادر کی حکومت قائم ہو گئی۔

ابتدائی حالات | حضرت محل کے ابتدائی حالاتِ زندگی تاریکی میں ہیں۔ صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ ۱۴ رجب ۱۲۶۱ھ (۱۵ دسمبر ۱۸۴۵ء) کو حضرت علیؓ کی محفلِ میلاد میں واجد علی شاہ کی نظر ایک سانولی لڑکی پر پڑی جسے "امراؤ" کہا جاتا تھا۔ واجد علی شاہ کو یہ نوخیز لڑکی پسند آئی اور "میک پری" کا نام دے کر رقص و سرود کی تعلیم کے لئے پری خانے میں شامل کر دیا۔[1]

واجد علی شاہ نے اپنے دور میں ایک پری خانہ بنا رکھا تھا جس میں حسین و جمیل عورتوں کو رقص و سرود

کی تعلیم دی جاتی تھی۔ حرم واجد میں آنے کے بعد امراؤ بھی اسی رقص خانے میں زندگی کے دن گذارنے لگی۔ واجد علی شاہ کی بیوی تھی اور سات پردوں میں رہتی تھی۔ جو سواری نکلتی تو بند پالکی میں اور محافظ دستے ساتھ ساتھ چلتے۔ بیرونی دنیا سے بے خبر زندگی کے دن گزار رہی تھی۔ کہ جنگ آزادی نے اس خاتون کے پوشیدہ جوہروں کو نمایاں کیا اور تاریکی میں آب حیات نکل آیا۔ انگریزوں نے واجد علی شاہ اختر کو گرفتار کرلیا تھا اور لکھنؤ کی فضا خاصی مکدر تھی۔ جب میرٹھ سے جنگ آزادی کے شعلے بھڑکے تو ان شعلوں نے لکھنؤ کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اور اس نازک وقت میں قیادت کا سہرا حضرت محل کے سر رہا۔

حضرت محل کے حالات زندگی میں کوئی ایسی نمایاں بات نہیں تھی جس کی بنا پر اسکی آئندہ زندگی کے بارے میں کوئی رائے قائم کی جاتی، معمولی ماحول میں پیدا ہوئی اور زمانے کی عام روش کے مطابق زندگی کے دن گزارتی ہوئی واجد علی کے حرم میں داخل ہوئی۔ زیادہ سے زیادہ اگر کہا جا سکتا ہے تو یہی کہ اللہ نے حسن ظاہری کا کچھ غیر معمولی حصہ عطا فرمایا ہوگا۔ جو پری خانے میں شمولیت کے لئے کافی تھا۔ لیکن ماحول پر نگاہ ڈالتے ہوئے یہ توقع عبث ہی تھی کہ کوئی عورت اس ماحول میں جنگ آزادی میں پروانہ وار کود پڑے گی اور ایسی مثال قائم کر جائے گی کہ آنے والی نسلیں یاد رکھیں گی۔ کیا حیرت انگیز بات ہوگی جو عیش و راحت کے میکدوں اور سرو خانوں میں بھی ٹھنڈی نہ ہو سکی۔ جب جنگ آزادی نے حالات پیدا کئے تو حضرت محل نے عورت ذات ہونے کے باوجود تمام ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھا لیا اور بلندی کردار کا یہ عالم تھا کہ انگریزوں کی ترغیبات کو درخور اعتنا نہ سمجھا اور حقارت کی نظر سے رد کر دیا۔

حضرت محل نے واجد علی شاہ کے حرم میں بارہ سال گزار دئے لیکن وہ درجہ اور مقام حاصل نہ کر سکی جو خاص محل اور دوسری بیگمات کو حاصل تھا۔ حضرت محل کے لئے دو ہزار روپیہ سالانہ مقرر تھا جب کہ خاص محل کے لئے پانچ ہزار اور بعض دوسری بیگمات کے لئے تین تین ہزار[۲] ——— مزید شہادت اس سے ملتی ہے کہ سفر کلکتہ میں چند بیگمات واجد علی شاہ کے ساتھ تھیں۔ لیکن حضرت محل لکھنؤ ہی میں رہیں۔

جنگ آزادی میں حصہ | جب جنگ کے شعلوں نے لکھنؤ کو اپنی لپیٹ میں لے لیا، تو فوجی سپہ سالار اکٹھے ہو کر ملکۂ عہد کی خدمت میں حاضر ہوئے جو ولی عہد مرزا دارا سطوت کی والدہ تھیں اور ولی عہد کو تخت پر بٹھانے کی پیشکش کی لیکن ملکہ نے نہایت یاس انگیز جواب دیا کہ سلطنت اودھ کے بانی نواب شجاع الدولہ انگریزوں کا مقابلہ نہ کر سکے تو بھلا ولی عہد دارا سطوت کیا کرے گا۔[۳]

امرا نے نوازم شاہی کے لئے تین لاکھ روپیہ مانگا اور ملکہ نے روپیہ دینے سے انکار کر دیا۔ اس کے بعد امراء واجد علی شاہ کی دوسری بیگم خاص محل کے پاس مرزا نوشیرواں قدر کی تخت نشینی کے لئے گئے لیکن نواب خاص محل نے بھی انکار کر دیا آخر ان امراء کی نظر واجد علی شاہ کے سب سے چھوٹے بیٹے برجیس قدر اور اس کی والدہ حضرت محل پر پڑی (برجیس قدر کا اصلی نام رمضان علی تھا اور حضرت مہر کی تحقیق کے مطابق شعبان ۱۲۶۲ھ میں پیدا ہوا تھا۔[۴]) امراء حضرت محل کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ملکہ سے مدعا بیان کیا۔ اس مجاہدہ نے کیا خوب جواب دیا کہ یہ میری انتہائی خوش قسمتی ہے کہ میرا بیٹا اپنے باپ اور اپنے ملک کو دشمن کے چنگل سے چھڑائے۔ چنانچہ ۵ جولائی ۱۸۵۷ء کو شام کے وقت چھ بجے خاقانی قصر میں مرزا برجیس قدر کی تخت نشینی کی رسومات ادا کی گئیں۔ اس وقت مرزا برجیس قدر کی عمر دس سال اور کچھ ماہ تھی۔

راجا جے لال نصرت جنگ کا خیال تھا کہ فوج تو برجیس قدر کو منظور کرے گی لیکن یہ ضروری ہے کہ بیگمات کی رضامندی بھی حاصل کر لی جائے۔ چنانچہ بیگمات کو جمع کیا گیا اور ان کے سامنے برجیس قدر کی تخت نشینی کا مسئلہ پیش کیا گیا لیکن کوئی بیگم بات نہ کرتی تھی۔ آخر حضرت محل نے بیگمات کی طرف سے کہا کہ اگر برجیس قدر کی تخت نشینی کی توثیق بیگمات کریں تو ہو سکتا ہے کہ انگریز واجد علی شاہ سے برا سلوک کرے۔ اس لئے بیگمات کو برجیس قدر کی تخت نشینی میں ملوث نہ کیا جائے۔ اس پر نواب ممو خان نے تجویز پیش کی کہ فوجی افسروں سے توثیق کرا لینے کے بعد بیگمات کی توثیق کی ضرورت باقی نہیں رہے گی۔ چنانچہ فوجی افسروں اور عمائدین ہی نے برجیس قدر کو شاہ بنا دیا اور بیگمات تماشائی بنی رہیں۔

برجیس قدر کی صغر سنی کی بنا پر حضرت محل ایجنٹ مقرر ہوئیں اور نواب ممو خان کو ناصر الدولہ کا خطاب دے کر نائب ریاست بنایا گیا۔ حقیقت میں تمام امور حضرت محل کی منظوری ہی سے جاری ہوتے۔ شہر میں منادی کرا دی گئی خلق خدا کی، بادشاہ دہلی کا اور حکم مرزا برجیس قدر بہادر کا۔[۵]

مسند نشینی کے بعد اودھ کے تعلقہ داروں کو لکھا گیا جس کی عبارت یہ تھی :-

"باقی ماندگان بیلی گارد کو قتل کر دو جو ان کو قتل کرے گا اس کا نصف علاقہ اُسے معاف ہو گا۔"

جنگ آزادی کی تحریک اس تیزی سے پھیلی کہ مولوی ذکا اللہ کے الفاظ میں صرف گیارہ دنوں میں اودھ کے کسی ضلع میں برٹش گورنمنٹ کی طرف سے کوئی حاکم نہ تھا اور انگریزی عملداری خواب

معلوم ہوتی تھی۔

اور ایک انگریز سر ہنڈی لارنس کے الفاظ ہیں :-

"سارے اضلاع ہماری حکومت سے نکل گئے ہیں اور حالات روز بروز بگڑتی جارہی ہے۔ تعلقہ دار مسلح ہو رہے ہیں۔ اور بعض نے دیہات پر قبضہ جمالیا ہے"

اس دور پر آشوب میں مدارس کا مرد قلندر احمد اللہ شاہ لکھنؤ وارد ہوا۔ (مفصل حالات پھر کبھی) تو حضرت محل اور ممو خان برجیس قدر کو لیکر شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی، کہ برجیس قدر کو آپ کی سرپرستی میں دیتی ہوں۔ اور حضرت محل نے احمد اللہ شاہ کو اپنا مشیر خاص بنالیا۔

جنگ آزادی کوئی منظم جد وجہد تھی نہیں کہ پہلے ہی سے انتظامات مکمل کر لئے گئے ہوتے، بلکہ اتفاقاً میرٹھ کے سپاہیوں نے بغاوت کردی اور یہ بغاوت ملک گیر بنیادوں پر شروع ہوگئی، اس لئے اندرونی انتظامات ادھورے ہی رہے، اور مجاہدین جہادِ آزادی میں کود پڑے، لیکن ان تمام شہروں کی نسبت لکھنؤ کو زیادہ وقت ملا اور حضرت محل کی حکمت عملی اور ممو خان کی دانشمندی سے شہر کا نظم ونسق بہتر ہوگیا۔ حالات پر سرسری نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انگریزی فوج ہیلی گارد (ریذیڈنسی) میں محصور ہوگئی تھی۔ سر ہنڈی لارنس جو انگریزی فوج کا مالک ومختار تھا۔ ۲ر جولائی ۱۸۵۷ء کو زخمی ہوکر ملک راہِ عدم ہوا۔ محصورین کی کمک ٹوٹ گئی تھی، اور ہیلی گارد کو انگریزوں سے خالی کرانا کوئی جان جوکھوں کا کام نہ تھا، چنانچہ مولانا احمد اللہ شاہ مدارسی کی سپہ سالاری میں ہیلی گارد پر حملہ ہوا، اور مجاہدین اس معرکہ میں خاصے کامیاب ہوئے اگرچہ اس جنگ میں مولانا احمد اللہ شاہ کا پاؤں زخمی ہوگیا۔

جنرل ہیوے لاک نے آخر جولائی میں کانپور کی فتح کے بعد لکھنؤ کی طرف پیش قدمی کی، لیکن پہلی منزل پر ہی لوٹ جانے کے سوا کوئی چارہ نظر نہ آیا۔ ۴ر اگست اور ۱۲ر اگست کو ہیوے لاک نے پھر پیش قدمی کی لیکن منہ کی کھائی۔ آخر کار ہیوے لاک کی جگہ آوٹرم مقرر ہوا۔ لیکن وہ بھی محصورین کی تعداد میں اضافے کا موجب ہی بنا۔ آخر سر کالن کیمبل نے پیش قدمی کی اور محصورین کو رہا کرانے کے بعد کانپور کا رُخ کیا۔ آخر ۱۷ر فروری ۱۸۵۸ء میں دوبارہ پیش قدمی کی اور مارچ میں لکھنؤ تاراج ہوگیا۔

فوج کی دلدہی | مختلف لڑائیوں میں احمد اللہ شاہ اور فیروز شاہ نے جرأت عظیمہ دکھائی۔ حضرت محل برابر فوج کی حوصلہ افزائی کرتی رہی۔ جنرل بخت خان کی توپیں پھن گئیں اور رنجیدہ ہوا۔ حضرت محل کو معلوم ہوا تو فرمایا توپیں پھن جانے کا رنج نہ کرو، میں تمہیں اور دوں گی[۲] ۲۳ر ستمبر ۱۸۵۷ء کو ہیوے لاک اور آوٹرم کی پیش قدمی کو روکنے کے لئے راجہ مان سنگھ نے زبردست مقابلہ کیا۔

بے شمار گورے مارے گئے اور دو ہزار کے لگ بھگ راجہ کے سپاہی بھی کھیت رہے۔ اور حضرت محل نے یہ کہہ کر حوصلہ افزائی کی۔ "بعد فتح روپیہ اور جاگیر دے کر خوش کروں گی" اور خلعت، دوشالہ، رومال اور "خطاب فرزندی" سے سرفراز کیا۔

لکھنؤ کے حالات امید افزا تھے۔ اور کامرانی مجاہدین کے قدم لے رہی تھی، لیکن دہلی میں انگریزی فوجوں کا پلہ بھاری تھا۔ چنانچہ جنرل بخت خان (بعد معرکۂ دہلی کے روح رواں تھے) لکھنؤ آگئے۔ فیروز شاہ اور نانا راؤ بھی اسی مرکز مجاہدین میں آ جمع ہوئے اور معرکۂ کارزار گرم ہو گیا۔ مولوی ذکا اللہ کے الفاظ ہیں: "ستر اسی ہزار آدمی بہادری، استقلال اور ہوشیاری سے اپنے مستحکم مقام کو استوار کر رہے تھے جن کو قومی عزت اور مذہبی دیوانگی نے اس عالی حوصلہ عورت حضرت محل کے علم کے نیچے جمع کر دیا تھا" ۸

آخر اپنوں کی غداری اور بے وفائی کے ہاتھوں لکھنؤ کا محاذ سرد پڑ گیا اور مجاہدین کی فوجیں پسپا ہونے لگیں۔ مہاراجہ بال کرشن جیسے لوگوں کی غداری کی وجہ سے شہر کا نظام درہم برہم ہو گیا۔ اور اس عالم افراتفری میں انگریزوں نے قیصر باغ پر بھرپور حملہ کر دیا۔ خان علی خان نے زبردست مقابلہ کیا لیکن گورے قیصر باغ میں داخل ہونے میں کامیاب ہو گئے۔

"چمن پر نہر خون جاری تھی، ہر طرف لاشوں کا انبار تھا۔ گورے سمٹ کر سنگین بارہ دری میں ہو رہے تھے۔ پیچھے سے جنگ بہادر کی فوج نے آکر باڑھ ماری سینکڑوں گر پڑے۔ آخر سب بھاگے۔ خان بھی زخمی ہو گئے۔" ۹

آخر ۱۴ مارچ کو یہ مجاہدہ دوسری بیگمات اور ڈھائی پردہ نشین عورتوں کے ساتھ اپنے ملازمین کے کوٹھوں پر سے ہوتی ہوئی گھسیاری منڈی کے پھاٹک سے شہر سے باہر نکلی اور دو راتیں مختلف مکانوں میں گزارنے کے بعد لکھنؤ کو الوداع کہا۔ چنانچہ ۱۶ مارچ ۱۸۵۸ء کو بیگم قدر کو لے کر پینس میں سوار ہوئیں کچھ اثاثہ ساتھ لیا اور سواری موسیٰ باغ کے ناکے سے نکلی کسی نے تاریخ کہی:

مرزا رمضان علی ناکام — شد جانب کوہ سبک تاز

تاریخ روانگی چو جستم — "نیپال شتاف" آمد آواز

رات بھر کے سفر کے بعد بھراؤں پہنچی، وہاں کے زمیندار راجا مردن سنگھ نے طوطا چشمی کی اور گستاخانہ پیش آیا۔ لیکن راہ عزیمت کی مجاہدہ کے لئے یہ درشت کلامی اور نامناسب برتاؤ چنداں حوصلہ شکن ثابت نہ ہوا۔ سفر جاری رہا اور محمود آباد اور بسواں باڑی ہوتی ہوئی خیرآباد پہنچی،

باقی ص ۳۳ پر